اور زیادہ صحیح ترجمے کی ضرورت ان ترجموں کے باوجود اب بھی بہرحال باقی ہے۔ اور کیا ہی اچھا ہو، اگر کچھ لوگ ایک بورڈ کی شکل میں ان تمام بزرگوں کے کام کو سامنے رکھ کر ترجمہ قرآن پاک کی طرف متوجہ ہوں۔

ترجمہ بورڈ میں کئی طرح کے لوگ ہونے چاہئیں، ایسے بھی جو علوم دینیہ کے ماہرین ہیں، اور ایسے بھی جو جدید افکار کے حامل ہیں اسی طرح ایسے حضرات بھی جو عربی اُردو دونوں زبانوں سے لگاؤ رکھتے ہیں اور ایسے حضرات بھی جو خصوصیت سے اُردو کے بانکپن کو سمجھتے ہیں۔ علمائے دین، تو قرآنی آیات کے صحیح پس منظر کی تعیین کر سکیں گے۔ علماء جدید ان آیات کی تشریح زیادہ بہتر طریق سے کر سکیں گے، جن کا تعلق مظاہر فطرت و تخلیق سے ہے، اور عربی داں اور اُردو جاننے والے حضرات ترجمہ کے لئے موزوں ترین پیرایہ بیان منتخب کرنے میں مدد دیں گے۔

ظاہر ہے، یہ کام صرف علماء دین کا نہیں۔ صرف ان لوگوں کا بھی نہیں، جو علوم دینی سے نابلد ہیں، اسی طرح ان لوگوں کے قابو کا بھی نہیں، جو عربی اور اُردو کا صحیح ادبی مذاق نہیں رکھتے۔ بلکہ یہ ان لوگوں کا کام ہے۔ جن میں یہ سب خوبیاں موجود ہیں۔

محمد حنیف ندوی

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

اسلام میں مادّی ترقّی کا مفہوم

اسلام نے کائنات کے ارتقا میں ابتدائی مراحل از روئے قرآن کریم مادّی ہی قرار دیئے ہیں کہیں افلاک کے متعلق ارشاد ہے کہ ابتدائی حالت میں ھی دخانؔ اور کہیں جدید سائنس کے (Nebular Hypothesis) مفروضۂ دخانی کی طرف صریح اشارہ ہے۔ اِن السموات والارض کانتا رتقاً ففتقنھما ۔ کہ ارض و سماوات ابتدا میں ایک مِلا جُلا مخلوط مادہ تھا اور اجرام فلکیہ جن میں از روئے ہیئت ہماری زمین بھی شامل ہے، بعد میں ایک دوسرے سے جدا اور منفرد طور پر متشکل ہوئے ہیں پھر نباتی اور حیوانی زندگی کے متعلق طبیعی سائنس کا ایک نظریہ قرآن کریم میں موجود ہے، جس پر ماہرین طبیعیات کو پہنچتے ہوئے بہت عرصہ لگا کہ نباتی اور حیوانی زندگی یعنی کسی قسم کی بائیولوجی کی زندگی پانی کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اور پانی ہی اس نباتی اور حیوانی زندگی کی اصل ہے۔ وجعلنا من الماء کلّ شیٍ حیّ۔ میں نے ایک بڑے ماہر سائنس دان کے سامنے یہ دو آیتیں پڑھیں، تو وہ ششدر رہ گیا اور کہنے لگا کہ تکوین عالم طبیعی کا مُسلّم نظریہ اب تمام سائنس دانوں کے نزدیک یہی ہے۔ خود مادہ میں کسی قسم کی جان ہے یا نہیں، اس کے متعلق قرآنی تعلیم یہ ہے کہ جان اور شعور کے مدارج میں اور مادی طبیعی عالم بھی مطلقاً بے جان و بے شعور نہیں اگرچہ اسکی حیات اور اسکے شعور کا انداز انسان پوری طرح نہیں سمجھ سکتا۔ تمام زمین تا آسمان، دُنیا و مافیہا خدا کی تسبیح میں مشغول ہیں یعنی مادی عالم کی بھی اپنی صلوٰۃ و تسبیح ہے۔ اسلامی حکماء جن کا نظریۂ کائنات یونانی فلسفہ کا رہین منت نہیں، مثلاً جلال الدین رومیؒ ان کا بھی یہی عقیدہ تھا کہ عالم عناصر طبیعی بھی روحانی عالم ہے۔ ہم مادے کو مردہ سمجھتے ہیں، خدا کے نزدیک وہ ایک زندہ حقیقت ہے:

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند
با من و تو مُردہ، با حق زندہ اند

غالبؔ کے ہاں بھی یہ نظریہ ملتا ہے کہ ذرّے سے لیکر آفتاب تک دل ہی دل اور ارواح ہی ارواح ہیں طوطیٔ شعور جس طرف بھی رُخ کرے اس کے سامنے کوئی آئینہ دل ہی ہو گا۔

از مہر تا بہ ذرّہ دل و دل ہے آئینہ
طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ

میر دردؔ جو ایک حکیمانہ مزاج کا صوفی شاعر ہے، کہتا ہے کہ:

آہستہ سے چل میانِ کہسار
ہر سنگ دکانِ شیشہ گر ہے

اِسلام سے قبل کے نظریاتِ کائنات جو بعض ادیان کا بھی جزو بن گئے تھے، عالمِ مادّی کو نظرِ حقارت سے دیکھتے

تھے۔ کوئی کہتا تھا کہ عالمِ طبیعی محض فریبِ ادراک یا مایا ہے۔ ارسطو کہتا ہے کہ وہ عدم ہے جس میں وجود کو قبول کرنے کی کم و بیش صلاحیت موجود ہے لیکن فی نفسہٖ اُس کا کوئی وجود نہیں۔ بعض مادّی عالم کو شیطانی عالم کہتے تھے اور یہ تعلیم دیتے تھے کہ مادہ ظلمتِ محض ہے اور شیطان اس مملکتِ ظلمت پر حکمران ہے۔ یا یہ کہتے تھے کہ مادّی عالم زندانِ ارواح ہے اور زندگی کا نصب العین اس قید خانے سے رہائی پانا ہے۔ طائرانِ لاہوتی قفسِ عنصری میں محبوس ہو گئے ہیں۔ اجرامِ فلکیہ میں تو ان کو نہایت مکمل ریاضیاتی نظم دکھائی دیتا تھا لیکن عالمِ خاک ماتحت افلاک میں زیادہ تر بدنظمی ہی پائی جاتی ہے۔ اس قسم کے تمام فلسفے اور ادیان انسان کو حیات کش رہبانیت کی طرف لے آئے۔ جسم چونکہ مادی عناصر سے مرکب ہے اس لئے اس کی تخریب کے درپے ہو گئے۔ بیک وقت نفس کشی اور جسم کشی عین روحانی ریاضت اور قربِ الٰہی کا وسیلہ سمجھی جانے لگی۔ اسلام نے سکھایا کہ اعضائے جسمانی روح کے آلات ہیں جو اس کو اِس غرض سے عطا ہوئے ہیں کہ وہ اُن کے ذریعے سے حصولِ خیر کر سکے۔ ہر عضو کا ایک وظیفہ ہے اور اس وظیفہ کا صحیح طور پر ادا کرنا اس کی تسبیح ہے۔ جسم کو تندرست اور پاک صاف رکھنا جزوِ دین قرار دیا گیا اور طہارتِ جسمانی عبادتِ ربانی کا جزوِ لاینفک بن گئی۔ غیر اسلامی مغرب میں رہبانیت کے دین والوں کا یہ عمل رہا کہ غسل کرنا ایک قسم کا گناہ ہے۔ جسم میں جب جوئیں پڑ جاتی تھیں تو جوؤں کو وہ خدا کے روحانی موتی کہتے تھے جس سے راہب کا پیراہن مرصع ہو جاتا ہے۔ ترکِ دنیا اور تخریبِ بدن کے بھیانک نظارے اب بھی بعض قسم کے سادھوؤں میں جا بجا نظر آتے ہیں۔ زمانۂ قدیم میں ان کی بڑی کثرت اور شدت تھی۔ مہاتما بدھ کے سوانح میں لکھا ہے کہ وہ بھی ان غلط روایات و شعائر کے زیرِ اثر کچھ عرصہ تخریبِ جسم اور بدن آزاری میں مصروف ہوئے لیکن حقیقت کے منکشف ہونے پر اس کو گمراہی قرار دیا۔

قرآن نے مادی عالم اور جسمانی زندگی کو تمام الزامات سے بری کر دیا۔ اور یہ تعلیم دی کہ مختلف عالموں میں خاک و افلاک میں، نبات و جماد و حیوان و انسان میں جو تقسیم ہے وہ قانونِ تدریج کے ماتحت ہے۔ "فضلنا بعضکم علی بعضٍ"۔ لیکن ان کے درمیان کوئی ناقابلِ عبور خلیجیں نہیں ہیں۔ حیات و کائنات تمام ایک مسلسل وجود ہے جس میں مدارج تو ہیں لیکن کہیں تباعد یا شگاف نہیں۔ نیچے سے اوپر تک مسلسل وجود کی کڑیاں ایک لامتناہی سلسلۂ حیات میں منسلک ہیں۔ جس طرح تمام موجودات کا خالق ایک ہے جس کی ذات میں کوئی تضاد نہیں۔ اسی طرح موجودات میں بھی تعاون اور ہم آہنگی ہے، تخالف نہیں۔ اسلام صرف خدا ہی کی وحدت کا قائل نہیں بلکہ اس سے مشتق موجودات کی وحدت کی بھی تعلیم دیتا ہے کہ عالم کے کسی پہلو کو نظرِ حقارت سے نہ دیکھا جائے، کیونکہ ربّ فقط کسی ایک عالم کا ربّ نہیں ہے بلکہ ربّ العالمین ہے۔ اسلام نے رہبانیت کو مذہب سے اور انسانی زندگی سے خارج کر دیا۔ اگرچہ غیر اسلامی اثرات سے بعض صوفیوں نے اس کو اختیار کیا۔ اسلام بار بار کہتا ہے کہ فلاحِ عامہ کے لئے بے دریغ خرچ کرو۔ تو اس سے لازم آتا ہے کہ پہلے جدوجہد سے اسبابِ حیات حاصل کرو اور اس فراوانی سے حاصل کرو کہ دوسروں کو اس سے فائدہ پہنچے۔ اسلئے اگر فقر کے یہ معنی ہوں کہ انسان کے پاس اپنے لئے ہی سامانِ حیات نہ ہو، تو ایسا فقر خیرات کیا کرے گا نہ تو

خود محتاج اور مسکین ہو گا۔ رسولِ کریمؐ نے فرمایا کہ "مفلسی سے دونوں جہانوں میں منہ کالا ہوتا ہے"۔ "الفقر سوادُ الوجہ فی الدارین"۔ اور پھر اس کی یوں تشریح فرمائی کہ مفلسی انسان کو کفر کے بہت قریب لے آتی ہے مفلس کیلئے ایمان کی سلامتی دشوار ہو جاتی ہے۔ جو شخص ہمت کر کے کمائے گا نہیں، وہ لازماً اپنی خودداری کھو کر گداگر ہو جائیگا اور لجا کر اور منہ سُکیڑ سکیڑ کر دوسروں کے سامنے دستِ سوال دراز کرتا رہے گا۔

رسولِ کریمؐ نے فرمایا کہ یوم الحساب میں سائلوں اور گداگروں کے منہ پر گوشت نہیں ہو گا۔ عالمِ مثال میں گداگر کی یہی صورت ہوتی ہے۔ جس فقر کی رسولِ کریمؐ نے تعریف کی ہے وہ ایک بہت بلند اندازِ حیات ہے۔ وہ زندگی کی خود اختیار کی ہوئی سادگی ہے، وہ فرائضِ حیات کو پورا کرتے ہوئے مادی نفع و ضرر سے بے نیازی ہے، وہ اس اخلاق کا نام ہے کہ جب دوسروں کی بنیادی ضرورتیں بھی پوری نہ ہو رہی ہوں تو کوئی صاحبِ دل آدمی اپنے پاس اسبابِ تعیش کا ڈھیر نہ لگاتا جائے۔

جس شخص کے پاس جائز طور پر مادی اسباب فراہم ہوں وہ دین اور اخلاق کے معاملے میں مقابلتاً آسانی سے فرائض کو انجام دے سکتا اور انسانی ہمدردی کا نمونہ پیش کر سکتا ہے۔ ایک مفلس مومن نے رسولِ کریمؐ سے شکایتاً یا کسی قدر تاسف سے کہا کہ غنی لوگ خیرات کرتے ہیں اور ثواب کماتے ہیں۔ ہم مفلس ایسا نہیں کر سکتے اس لئے گھاٹے میں رہتے ہیں۔ نبی رحیم و حکیمؐ نے اس کی تسلّی کے لئے فرمایا کہ تم اس صدقہ کی بجائے عبادت زیادہ کر لیا کرو۔ پھر سائل نے کہا کہ بعض امیر ایسے ہیں کہ خیرات بھی کرتے ہیں اور عبادت بھی کرتے ہیں۔ وہ پھر بھی ہم سے آگے آگے ہی رہینگے۔ رسولِ کریمؐ نے فرمایا کہ پھر یہ فضلِ الٰہی ہے یعنی ایسی صورت میں مساوات کی اور کیا تجویز کر سکتا ہوں۔ اسلامی تعلیم یہ ہے کہ رزق کو اپنی کوشش سے زمین کے اوپر بھی ڈھونڈو اور پیدا کرو، اور خبایائے ارض یعنی زمین کے چھپے ہوئے خزانوں میں سے بھی نکالو۔ خوب کماؤ اور دولت پیدا کرو۔ لیکن ظلم کے ساتھ نہیں، حدودِ الٰہی کو نظر انداز کر کے نہیں، بلکہ رحم اور عدل کے ساتھ اور اس کے بعد اس فراوانی کو نوعِ انسان کی فلاح کے لئے پھیلاؤ۔ خزانے کے سانپ بن کر نہ بیٹھ جاؤ۔ اس تعلیم کا نتیجہ تھا کہ مسلمان صدیوں تک دوسری معاصر قوموں کے مقابلے میں زیادہ خوش پوش تھے۔ زیادہ اچھے مکانوں میں رہتے تھے۔ اچھی سواریاں رکھتے تھے۔ ایک حدیث میں ہے کہ فراخ مکان اور تیز سواری خدائے کریم کی خاص نعمتوں میں سے ہے جس کو حاصل ہو وہ بڑا خوش نصیب ہے۔

ایک مغربی مصنف نے لکھا ہے کہ بارھویں تیرھویں صدی تک یہ حال تھا کہ اسلامی ممالک میں متوسط درجے کا مسلمان رہائش اور پوشش میں یورپ کے شہزادوں سے بھی بہتر رہتا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ جلد جلد کپڑے بدلنے کا رواج یورپ کے اعلیٰ طبقوں میں بھی نہ تھا۔ اور نہانا تو کبھی شاذ و نادر ہی ہوتا تھا۔ باغبانی کا فن مسلمان مغرب میں لے گئے اور یورپ میں بہت سے اعلیٰ درجے کے میوے مسلمانوں کے ذریعے سے وہاں پہنچے ہر دولتمند ایک اچھا باغ بنانا جزوِ تہذیب و تمدن سمجھتا

تھا مسلمانوں نے فنِ تعمیر میں جو کارہائے نمایاں کئے ان پر سے بعض اب بھی صفحہ روزگار پر موجود ہیں۔ جو فنکاروں سے خراجِ تحسین حاصل کرتے اور ناظرین کے لئے فردوسِ نظر ہیں مسلمانوں کی ترقی محض اخلاقی اور علمی ترقی نہ تھی۔ بہتر اخلاق اور بہتر عمل سے مادی زندگی کو بھی فروغ حاصل ہوتا ہے۔ ایمانداری سے صنعت اور تجارت میں ترقی ہوتی ہے مسلمانوں نے پہلی قوموں کی صنعتوں کو حاصل کیا اور پھر اپنی جدتوں سے ان کو چار چاند لگائے۔ چمڑے کی اعلےٰ درجے کی دباغی مسلمانوں نے اہلِ مغرب کو سکھائی، چنانچہ اب تک چمڑے کی ایک اعلیٰ اور ملائم قسم (Morrocco Leather) یعنی مراکشی چمڑا کہلاتی ہے۔

کاغذ مسلمانوں کے ذریعے سے یورپ میں پہنچا۔ اب مغرب کے مورخین اس کا اقرار کرتے ہیں، کہ تجربی سائنس کی ابتداء مسلمانوں نے کی جس کی طرف سے یونانی حکمت بالکل غافل رہی تھی۔ یورپ کی نشاۃِ ثانیہ (Renaissance) بہت کچھ مسلمانوں کی رہینِ منت تھی۔ اس کے متعلق علامہ اقبالؒ نے کہا ہے کہ:

بجھ کے شمعِ ملتِ بیضا پریشاں کر گئی اور دیا تہذیبِ حاضر کا فروزاں کر گئی
دورِ گردوں میں نمونے سینکڑوں تہذیب کے یل کے نکلے مادرِ ایام کی آغوش سے

اب کوئی پوچھے گا کہ عالم مادی کے متعلق اسلام کا نظریہ بالکل صحیح اور حیات پرور اور مسلمانوں کی ابتدائی شش صد سالہ ترقی کی داستان بھی درست لیکن اب ان کو کیا ہوا ہے، یہاں تک مادی ترقی کا تعلق ہے سب طرف پستی ہی پستی ہے۔ مراکش سے لیکر انڈونیشیا تک مسلمان اقوام پسماندہ اقوام کے زمرے میں داخل ہیں۔ گذشتہ تین سو سالوں میں یورپ علوم و فنون اور مادی ترقی میں دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کرتا ہوا کہاں سے کہاں نکل گیا۔ مسلمان اقوام کو کیا سانپ سونگھ گیا کہ یہ سوتے ہی رہے۔ مغربی قوموں میں صدیوں کے جمود کے بعد مسلسل حرکت پیدا ہوتی رہی اور یہاں تمام حرکت جمود میں تبدیل ہو گئی۔ ہمارا دریائے حیات ساحل کی طرح آسودہ ہو گیا اور وہاں ساحل بڑھتی ہوئی طغیانی کی زد میں آتے گئے۔ ملتِ اسلامیہ کو متحرک کرنے والا اور جمود کا دشمن اقبالؒ کہتا ہے:

ساحلِ آسودہ گفت گرچہ بسے زیستم ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من کیستم
موجِ ز خود رفتۂ تیز خرامید و گفت ہستم اگر میروم گر نروم نیستم

مغرب کیسے آگے بڑھتا گیا؟ اور مسلمان کیسے پیچھے رہتے گئے اس کے اسباب کا تجزیہ بڑی وسیع تحقیق چاہتا ہے۔ فلسفۂ تاریخ کا ایک محقق لکھتا ہے کہ قومیں ایک اندازِ حیات پر زندگی بسر کرتے ہوئے اور اپنے خاص افکار و جذبات سے تہذیب و تمدن کا ایک ڈھانچا بناتے ہوئے۔ کوئی چھ سو برس کے عرصے میں تھک جاتی ہیں، اندازِ حیات کی کچھ لکیریں پڑ جاتی ہیں، اور زندگی ان لکیروں سے اِدھر اُدھر نہیں ہو سکتی۔ اس کے بعد انقلاب کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو پہلے تمام ڈھانچے کو گرا کر نئی تعمیریں بنائے۔ مولانا روم کا مشہور شعر ہے کہ: